ہندوستان میں عربی کا نظامِ تعلیم اور جدید عربی

جناب محمد راشد صاحب لکچرر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

قبل اس کے ہم یہ بتائیں کہ ہندوستان میں جو عربی کا نظام تعلیم ہے وہ کس حد تک موجودہ حالات کے مطابق ہے اور کہاں تک ہماری قومی زندگی کے لئے مفید ہے، یہ بتانا ضروری ہے کہ عربی زبان کن نازک مرحلوں اور دشواریوں سے گزر کر آج ایک معیاری اور زندہ زبان کی حیثیت سے عرب ممالک میں زندگی کے ہر شعبہ میں استعمال ہو رہی ہے۔

عربی اپنی طویل و عریض تاریخ میں کبھی بھی کسی مخصوص ڈھانچہ کی پابند نہیں رہی ہے، بلکہ اس میں تبدیلیاں پیدا ہوتی رہی ہیں اور یہ تبدیلیاں ہمیشہ عربوں کے سیاسی، ثقافتی اور مذہبی حالات سے وابستہ رہی ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ زبان کی تبدیلیاں ان کی زندگی کی علامت رہی ہیں لیکن یہ تبدیلیاں اسی وقت تک مقبول و مناسب رہیں جب تک عربوں میں زندگی، اپنی تہذیب و ثقافت کے بڑھانے کا حوصلہ پایا جاتا تھا۔ چھٹی صدی ہجری کے بعد جب عربوں کی سیاسی اور سماجی زندگی جمود و تعطل کی شکار ہوئی اسی لمحہ سے عربی زبان و ادب ایک مرحلہ پر ٹھہر گئیں، پھر جب آہستہ آہستہ عرب حکومتیں ختم ہوتی گئیں اور عرب دوسری قوموں کے غلام ہو گئے ان کی زبان

کاسرمایہ بھی ضائع ہونے لگا، کیونکہ عوامی زندگی میں دوسری زبانوں نے عربی کی جگہ لے لی اس طرح اس کا دائرہ تنگ اور محدود ہونے لگا۔ عوامی زندگی سے وہ ہٹ کر کتب خانوں اور اپنی درسگاہوں میں محصور ہوگئی، عوام جن کی زبان عربی تھی تعلیم کی کمی کے باعث صحیح اور علمی زبان بولنے اور لکھنے سے قاصر ہوگئے[1]، عربی کی یہ صورت حال بیسویں صدی کی ابتدا تک جاری رہی لیکن جب مختلف علاقوں میں قومی اور مذہبی تصورات رونما ہونے لگے زبان میں بھی زندگی آنے لگی سب سے پہلے عرب قومیت کا تصور زبان کی زبوں حالی ہی کو دیکھ کر پیدا ہوا اور بعد میں اس میں سیاسی اور سماجی مسائل شامل ہونے لگے۔

شام کے مشہور قومی شاعر فواد الخطیب زبان کی کس مپرسی کی داستان اس طرح سناتے ہیں:

جاروا علی لغۃ القرآن فانصدعت لہ القلوب وضج البیت والحرم
فالقدس باکیۃ والشام شاکیۃ وفی الحجاز یکاد الرکن ینحطم

عربوں نے اپنی قومی زبان ہی کو اپنے وقار و عزت کا ہر دور میں مظہر تصور کیا ہے، پھر ادیبوں اور شاعروں نے زبان کے رشتہ کو دوسرے رشتوں پر فوقیت دی ہے۔ ابوتمام اس فلسفہ کو یوں بیان کرتا ہے:

ان نختلف نسباً یؤلف بیننا أدب اقمناہ مقام الوالد
او یختلف ماء الحیاۃ فماؤنا ابداً تحدر من غمام واحد

اِدھر بیسویں صدی میں جب قومی تصورات عام ہونے لگے اُس تک میں عرب شاعروں نے اپنی قومی یکجہتی کے لئے زبان ہی کو اتحاد کا رمز قرار دیا، شوقی کہتا ہے:

نصحت ونحن مختلفون داراً ولکن کلنا فی الھم شرق
ویجمعنا اذا اختلفت بلاد بیان غیر مختلف ونطق

---

[1] حسنی السبح، مجلۃ المجمع العلمی دمشق، ۱۹۶۹ء جلد ۴۲

ایک دوسری جگہ اپنے خاص انداز میں یوں کہتا ہے :

ونحن فی الشرق والفصحی بنو رحم ونحن فی الجرح والآلام إخوان

جب مختلف علاقوں میں قومی تحریکوں کا زور ہوا اس وقت عربوں کو آزادی نصیب ہوئی، آزادی حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا آزادی کے صحیح اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے زبان وتہذیب کو فروغ دینا تھا، کیونکہ صدیوں کی پچھڑی ہوئی زبان کو آگے بڑھانا اور اسے عوام اور خواص کی زبان بنانا آسان بات نہیں تھی، عرب ممالک مختلف اوقات میں آزاد ہوئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خودمختاری کا جوش ہر جگہ عام ہوا، پھر سامراج کے اشاروں سے مقامی قومیت سر اٹھانے لگی اس کا یہ مطلب تھا کہ جہاں عرب علاقوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تھے وہیں ان کی زبان اور ان کا کلچر بھی الگ ہو جائے یعنی جغرافیائی اور سیاسی تقسیم کے ساتھ ساتھ لسانی اور ثقافتی تقسیم بھی ہو جائے۔ لیکن ان ملکوں کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس دور میں کچھ مذہبی اور سیاسی تحریکیں اس انداز میں اٹھیں جن کی بدولت مقامی اور علاقائی عصبیتیں مدھم پڑ گئیں[1]۔ پھر اسکولوں اور کالجوں میں جب مادری زبان یعنی عربی ذریعہ تعلیم بنی تو فصیح اور صحیح ہی زبان کو اہمیت حاصل ہوئی، اسکولوں میں تمام موضوعات کی کتابیں فصیح اور آسان زبان میں لڑکوں کے معیار کے مطابق مرتب کی گئیں، اس طرح قومی تصور کو فروغ دینے میں نصاب تعلیم کا بھی بڑا دخل ہے۔ دوسری طرف علمی اور ادبی کتابیں بھی معیاری زبان میں لکھی گئیں، البتہ صحافت، ریڈیو، افسانہ وناول کی زبان کے متعلق مختلف ادیبوں نے الگ الگ رائیں پیش کیں، کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ ان کی زبان مقامی اور عوامی ہونی چاہیئے کیونکہ ان چیزوں کا تعلق براہ راست عوام اور سماج سے ہے اس لئے مقامی لہجوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ان کو اپنانے میں زبان اور قومیت دونوں کی خدمت ہوگی، یہ نظریہ بڑی حد تک معقول تھا لیکن اس کے جو نتائج مرتب ہوتے اس سے زبان کی مرکزیت کو کافی نقصان پہونچتا،

---

[1] مشکلات اللغۃ، محمود تیمور ص ۹۲

کیونکہ ہر علاقہ کی زبان دوسرے علاقہ کی زبان سے بالکل مختلف ہے اس لئے اگر انھیں صحافت، ریڈیو، افسانہ و ناول کی زبان کے لئے اپنایا جاتا تو وہی فروغ پاتیں، دوسری طرف عوام کا ذہنی اور فکری معیار بھی بلند نہیں ہونے پاتا، اس لئے اہل فکر و نظر نے درمیانی راہ اختیار کی وہ یہ تھی کہ صحافت، ریڈیو، افسانہ کی زبان صحیح اور فصیح تو ہو لیکن بہت سے مقامی الفاظ اور ترکیبیں جو اصلاً عربی ہیں لیکن نحوی اعتبار سے غلط ہیں انھیں اپنایا جائے اس طرح یہ زبان عوام اور خواص دونوں کے درمیان بہترین رابطہ بن سکتی ہے، دوسری طرف ہر علاقہ کے عوام دوسرے علاقہ کے عوام کی زبان سے بھی واقف ہوں گے اور علاقائیت آہستہ آہستہ مرکزیت میں بدل جائے گی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد صحافت اور ریڈیو کی ایک مستقل زبان ہوگئی جو ہر علاقہ میں آسان اور عام فہم زبان تصور کی جاتی ہے اور بہت سے مقامی اور عوامی الفاظ اور جملے اس سلیقہ سے استعمال ہونے لگے کہ وہ زبان کا جز بن گئے۔ دوسری علمی اور فنی زبان بھی عرب ادیبوں کی مشترکہ کوششوں سے بہت آگے بڑھی اس سلسلہ میں قاہرہ، دمشق، بغداد کی مجمع العلمی نے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے، سائنس کی جدید اصطلاحیں، صحیح ترجمے، قدیم الفاظ سے نحت و اشتقاق کو منظم اور صحیح طریقوں سے کیا گیا جس کی بدولت عربی موجودہ دور کی تمام ضروریات کو پورا کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اس طرح ہم جدید عربی کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ علمی اور ادبی زبان جس میں علوم و فنون کی اصطلاحیں، سیاسی اور سماجی تعبیریں شامل ہیں۔ یہ زبان تقریباً تمام عرب ممالک کی مشترکہ زبان ہے اور ہر مصنف اور ادیب اس کو استعمال کرتا ہے۔

۲۔ صحافت، ریڈیو، افسانہ و ناول کی زبان، یہ زبان زیادہ تر فصیح ترکیبوں پر مشتمل ہے البتہ اس میں مقامی ترکیبیں اور الفاظ بھی شامل ہیں لیکن انھیں اچھے استعمال کے ذریعہ عربیت کا جز بنا دیا گیا ہے اور یہی زبان حکومت کے دفتروں اور سیاسی حلقوں میں استعمال ہوتی ہے۔

۳۔ گھریلو اور روزمرہ کی زبان جو ہر علاقہ میں بولی جاتی ہے یہ زبان عربی لہجہ میں بولی تو ضرور جاتی ہے لیکن اس میں غیر عربی الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں یہ الفاظ یا تو مقامی ہوتے ہیں یا دوسری زبانوں سے آتے ہیں، مثال کے طور پر مراکش، تیونس، جزائر کی مقامی زبان میں بربری الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں، پھر فرانس کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے بہت سے فرانسیسی الفاظ عوامی زبان کے جز بن گئے ہیں، ادھر مصر و شام میں ٹرکی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ عراق میں فارسی الفاظ بہت عام ہیں، اس طرح ہر علاقہ کی عوامی زبان دوسرے علاقہ سے بالکل مختلف ہوتی ہے، دوسرے بولتے وقت نحو و صرف کے قواعد کو بالکل نظرانداز کر دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مقامی زبانیں علمی زبان پر اثرانداز تو ضرور ہوئیں لیکن انھیں علمی حلقوں میں مناسب مقام نہیں مل سکا، بیسویں صدی کی ابتدا میں جب مقامی قوتیں ابھر رہی تھیں اس وقت چند لوگوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ مقامی زبانوں ہی کو سرکاری زبان بنایا جائے۔ انھوں نے اپنے اس نظریہ کے لئے مختلف دلیلیں بھی پیش کیں۔

مصر کے مشہور ادیب اور فنکار محمود تیمور لکھتے ہیں:

مقامی زبانوں کے حامیوں اور علمبرداروں کا کہنا ہے کہ علمی اور فصیح زبان کے سیکھنے میں بڑی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے، ہمارے بچے گھر میں اپنے والدین اور سوسائٹی میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جو زبان بولتے اور استعمال کرتے ہیں وہ اسکول کی زبان سے بالکل مختلف ہوتی ہے، اسی طرح عوام بھی جو زبان روزمرہ بولتے ہیں سرکاری محکموں میں کام نہیں آتی ہے، گویا عربی کو بھی وہ غیر زبان کی حیثیت سے پڑھتے اور سیکھتے ہیں اور اسے استعمال کرتے ہیں، دوسری طرف فصیح عربی کے قواعد و ضوابط بھی مشکل ہیں، اس لئے بجائے فصیح عربی کے عوامی زبان کو اسکول، تالیف و تصنیف ریڈیو و صحافت کی زبان بنا دیا جائے تو بہت سی پریشانیوں سے نجات مل سکتی ہے اور اس طرح ہم عوام کے ضمیر سے بھی قریب ہو سکتے ہیں، گویا عوام اور خواص کے درمیان زبان کی وجہ سے جو کچھ فاصلہ ہے وہ بھی ختم ہو سکتا ہے۔

محمود تیمور ان لوگوں کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں :

حقیقت یہ ہے کہ اگر عوامی زبان کو اسکول و کالج، تالیف اور تصنیف کی زبان بنا دیا تو اس کے بھی کچھ نہ کچھ اصول بنانے پڑیں گے، کیونکہ اگر بولنے میں اصول و قواعد کی پابندی ضروری نہیں ہے تو جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے اس کے لئے کسی نہ کسی مرحلہ میں اصول و ضوابط کا پابند ہونا پڑے گا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہر شخص کی الگ الگ زبان ہو جائے گی اور زبان کو جو لوگوں کے درمیان بہترین رابطہ تصور کیا جاتا ہے ختم ہو جائے گا۔ دنیا کی کوئی بھی ایسی زبان نہیں جس کے کچھ نہ کچھ اصول نہ ہوں اس صورت میں کیوں نہ اسی زبان کو سرکاری زبان بنایا جائے جس کے اصول و ضوابط بڑی حد تک مرتب ہیں، البتہ ان میں موجودہ حالات کے مطابق کچھ تبدیلی ہونی چاہیئے، تبدیلی کا حق عوام الناس کو نہیں بلکہ اہل علم و نظر کو ہونا چاہیئے[1]

یحییٰ حقی جو بڑی حد تک اپنے افسانوں میں عوامی الفاظ کے حامی ہیں لیکن جہاں تک زبان کی مرکزیت کا تعلق ہے پرجوش انداز میں فصیح زبان کی حمایت کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ترقی کے اس دور میں ہم بغیر محنت اور سنجیدگی کے زندگی کے کسی گوشہ میں ترقی نہیں کر سکتے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ عربی کو عالمی زبانوں میں مقام حاصل ہو تو ہمیں اس کے لئے دل و جان سے کوشش کرنی چاہیئے آسان طلبی اور بے اصول پسندگی کے راستہ کو ترک کرنا پڑے گا۔ زبان کی ترقی کا راز (عامیہ اور فصحی) عوامی اور علمی پر منحصر نہیں بلکہ اس کا انحصار اس پر ہے کہ ہم نئے نظریات کو کس حد تک اپناتے ہیں، اپنے طرز نگارش کو موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کہاں تک آگے بڑھاتے ہیں، اگر ہم عوامی الفاظ کے استعمال پر مصر ہیں تو ہمیں اس حالت میں بھی محنت و سنجیدگی سے کام کرنا پڑے گا کیونکہ ہمارے سامنے ہزاروں الفاظ ہیں ان میں ہمیں انھیں کا انتخاب کرنا ہوگا جو ہماری زبان کے لئے زینت بن سکیں، بے راہ روی میں زبانیں ترقی نہیں کرتیں[2]۔

---

[1] مشکلات اللغۃ، محمود تیمور صـ ۱۸۸ [2] مجلۃ المجلۃ جلد ۱ ۱۹۵۷ء عدد ۱

یہ تمہید اس لئے بیان کی گئی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ موجودہ دور میں زبان کے بارے میں کیا تصورات پیدا ہوئے اور زبان کن کن مرحلوں سے گزر کر آج ایک ایسی معیاری زبان بنی ہے جس پر اہل قلم و علم کا بڑی حد تک اتفاق ہے، اس کی روشنی میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آج جو زبان ہم ہندوستان میں پڑھاتے ہیں اُس کا موجودہ عربی سماج سے کس حد تک ربط و لگاؤ ہے اور اس سے ہم آج کے حالات خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، ادبی ہوں یا علمی کس حد تک سمجھ سکتے ہیں، پھر ہم جس دور کی زبان و ادب پڑھاتے ہیں اس سے ہماری ذہنی تربیت کیا ہوتی ہے؟ جن ادیبوں اور شاعروں کو ہم پڑھتے ہیں خواہ وہ جاہلی دور کے ہوں یا اسلامی، اُموی دور کے ہوں یا عباسی ان سے ہمیں زبان کی روح اور حقیقت سمجھنے میں کس حد تک مدد ملتی ہے۔

عربی ہندوستان میں صدیوں سے پڑھی اور پڑھائی جاتی رہی ہے، یہاں کے علماء نے اسلامی تہذیب و ثقافت کی جو خدمت کی ہے اس کا اعتراف عرب بھی دل کھول کر کرتے ہیں، عربی زبان وہ اسلامی ثقافت کو سمجھنے کے لئے پڑھتے اور پڑھاتے تھے۔ کیونکہ اس کا سرمایہ زیادہ تر اسی زبان میں تھا، گویا مذہبی روح اور جوش ان کو عربی زبان سیکھنے پر آمادہ کرتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ یہی جوش صدیوں خود عرب ممالک میں پایا جاتا تھا، زبان کی خدمت وہ اس لئے کرتے تھے کہ وہ قرآن و حدیث کی زبان ہے، اور یہ تصور تقریباً ۷ صدی ہجری کے بعد عربوں میں آنے لگا تھا، اور پھر جوں جوں ان کی علمی و فکری زندگی میں زوال آتا گیا یہ تصور بڑھتا گیا، لیکن عربوں کے عروج کے دور میں زبان کو زبان کی حیثیت میں پڑھا اور پڑھایا جاتا تھا اور اس کی بہت سے ادیبوں اور مصنفین نے جو عظیم الشان خدمات انجام دیں ان کا مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، بلکہ وہ اس زبان کی خدمت کر رہے تھے جو سماج و سوسائٹی کی روح تھی، زبان کی خدمت کو سماج کی خدمت تصور کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اس کے بڑھانے اور ترقی دینے میں ہر مذہب و عقیدہ کے لوگوں کا ہاتھ ہے۔

زبان و ادب کو کسی مذہب و عقیدہ سے وابستہ کرنا اس کی افادیت کو ختم کرنے کے

مرادف ہے۔ زبانیں قوموں کی زندگی کی جز تو ضرور ہیں لیکن دنیا کی کوئی زبان کسی مذہب کا جز نہیں تھی اور نہ ہے۔ خود عربوں نے مذہب کی بنا پر شعراء اور ادباء کے درمیان کبھی بھی تفریق نہیں کی، ابن مقنع اپنی زندیت کے باوجود ہر دور میں نثر کا امام تصور کیا جاتا رہا، حسان بن ثابت کو نابغۂ زبیانی پر اسلام کی وجہ سے کبھی بھی فوقیت حاصل نہیں ہوئی۔ علمی اور ادبی مسائل میں عقیدہ و مذہب کو بنا، بنانا ذہنی پستی اور شکستگی کی دلیل ہے۔ آج عرب ممالک میں سیاسی اور سماجی مسائل میں اختلاف کے باوجود زبان کو وہ قومی ترقی کا رمز تصور کرتے ہیں، اس کو علمی و فنی سطح پر لانے میں ہر مذہب و عقیدہ کے لوگوں کا ہاتھ ہے یہی وجہ ہے کہ آج یہ تمام عرب ممالک کی مشترکہ قومی زبان ہے۔

ہندوستان میں بدقسمتی سے جدید عربی کا جو تصور ہے وہ عجیب و غریب ہے، یہاں یہ رجحان پھیلا ہوا ہے کہ عربی کا معیار پست ہو گیا ہے اور جو زبان آج استعمال کی جا رہی ہے اس کا اصل عربی سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ یہ رجحان یہاں اس لئے پیدا ہوا کہ جو زبان ہم یہاں پڑھاتے ہیں وہ زیادہ تر قدیم پر مشتمل ہے، پھر ہمارے یہاں نصاب تعلیم میں نظم کا مجموعہ نثر کے مقابلہ میں زیادہ رہا ہے، اور نثر کا مجموعہ بھی جو ہم پڑھتے تھے وہ بھی ایک خاص ذہنیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، مقامات بدیع الزمان الہمدانی، مقامات الحریری، نہج البلاغۃ، رسائل اخوان الصفا، وغیرہ وغیرہ۔ ان کتابوں کی زبان پڑھ کر ہم انؐ کے مصنفین کو داد اور خراج تحسین تو ضرور پیش کر سکتے ہیں لیکن جہاں تک زبان کے سیکھنے کا تعلق ہے وہ کبھی بھی معاون نہیں ثابت ہو سکتیں، پھر ان کتابوں کو غور سے پڑھا جائے تو ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نثر میں کیا تبدیلی ہوئی کتابوں کی عبارتوں سے ان کے دور کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

گویا طالب علم کو اس لحاظ سے تو فائدہ ضرور ہو سکتا ہے کہ مختلف دوروں میں نثر کا کیا معیار رہا ہے۔ دوسری طرف بہت سے مشکل الفاظ، پیچیدہ ترکیبوں سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے وہ ان سے کسی بھی حالت میں استفادہ نہیں کر سکتا، کیونکہ جو زبان

حالات کے مطابق نہ ہو صحیح ذہنی تربیت نہیں کرسکتی، جس زبان کو ہم صحیح معنوں میں استعمال نہ کرسکیں اس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہی ہوتا ہے جس کے مختلف اسباب ہیں۔

ہر زمانہ کی زبان وادب کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو پڑھنے والے کے ذہن پر ہر لحاظ سے اثر انداز ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ جس ادیب وشاعر کو وہ پسند کرتا ہے اس کے شعر اور اس کے جملوں اور محاوروں کو اپنی عبارتوں میں استعمال کرنے میں اپنی ترقی اور کامیابی تصور کرتا ہے۔ جن ادیبوں کی وہ نقالی کرتا ہے اگر وہ اسی کے دور کے ہوں تو اس میں شبہ نہیں کہ اس سے زبان سیکھنے میں کافی مدد ملتی ہے، لیکن اگر وہ کسی دوسرے دور وزمانہ کے ہوں تو اس کے غلط اثرات ہوتے ہیں، پڑھنے والا ان کے جملوں، ان کے محاوروں کو جب استعمال کرتا ہے تو اس کا مذاق اڑلیا جاتا ہے پھر اس کو اپنی ناکامی اور کمتری کا احساس پیدا ہوتا ہے جو اس کی اپنی ترقی کے لئے خطرناک ہوتے ہیں۔ کیونکہ جملے، محاورے، خود الفاظ کے معانی زمانہ وحالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں، پھر اشتقاق ونحت کے جو اصول ہیں ان کی وجہ سے کل کی زبان آج پرانی معلوم ہوتی ہے۔ شاید اسی کی بدولت زبانیں بیشتر زندہ وتازہ رہتی ہیں۔ ہمارے سامنے ایسے الفاظ کی بڑی تعداد ہے جن کے معانی قدیم لغت میں کچھ اور ہیں لیکن آج وہ کسی خاص مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے لئے چند الفاظ پیش کرتا ہوں:

۱۔ المظاهرة: آج مظاہرہ کسی کے خلاف نعرہ لگانا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے قدیم لغت میں مدد کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

۲۔ تجمہر الناس: لوگوں کا ایک جگہ جمع ہونا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، قدیم لغت میں کسی کے مقابلہ میں سر اونچا کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

۳۔ القنبلة: بم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، قدیم لغت میں اونٹوں کی جماعت کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

۴۔ الفشل : ناکامی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، قدیم لغت میں سستی کاہلی کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

۵۔ القاع : گہرائی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، قدیم لغت میں وادی کی سطح کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

۶۔ الشقی : چور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قدیم لغت میں بدبخت کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

۷۔ اعدم المجرم : مجرم کو پھانسی دے دی گئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قدیم لغت میں اعدم فلاں فلاں غریب و مفلس ہوگیا کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

۸۔ السیارۃ، القطار، القاطرۃ، الجریدۃ، الحوالۃ، طعائف، البرقیۃ، التقاعد، الامین العام، التامین، الاستقلال، الاحتلال، المذیاع، الجامعۃ، الکلیۃ، التیامم، التدویل، التصنیع وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے نصاب تعلیم میں اُسی زبان پر زور دینا چاہئے جو موجودہ حالات میں استعمال ہوتی ہے، کیونکہ اُسی کے ذریعہ عوام کے سیاسی، سماجی، مذہبی رجحانات و تصورات سے پڑھنے والا واقف ہوسکتا ہے۔ جب تک کسی قوم کا مزاج نہ سمجھ لیا جائے صحیح معنوں میں اُس کی زبان پر قدرت حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ بہت سے جملوں، محاوروں میں وہاں کے سماج و رواج کی طرف اشارے ہوتے ہیں، خاص طور سے مزاحیہ ادب و شعر کا بیشتر حصہ عوامی زندگی سے وابستہ ہوتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ قدیم ادب و زبان کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ کیونکہ عربی تمدن و تہذیب کی تمام روایات اسی ادب سے وابستہ ہیں، البتہ نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلی ہونی چاہئے جس میں قدیم و جدید ادب و زبان کی ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس سلسلہ میں چند تجویزیں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ سب سے پہلے زبان کی ابتدا جدید دور کی زبان سے کریں تاکہ پڑھنے والا نئی ترکیبوں

نئے لفظوں سے خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی مانوس اور واقف ہوسکے، اس کے لئے ضروری ہے کہ موجودہ دور کے آسان لکھنے والے ادیبوں کے مقالات اور ان کی کتابوں سے اچھے انتخابات تیار کئے جائیں جس میں ہر طرح کے مضامین شامل ہوں۔

۲۔ صحافت کی زبان جو زیادہ تر سرکاری دفتروں، سیاسی حلقوں میں استعمال ہوتی ہے اس لئے مختلف عرب ملکوں کے صحافت نگاروں کے اداریوں کا مجموعہ تیار کیا جائے جس سے ہمارے طالب علموں کو نئی اصطلاحات کا علم ہوسکے۔

۳۔ قدیم ادب خواہ جاہلی دور کا ہو یا عباسی اس کو اسی وقت پڑھائے جب طالب علم عربی سے مانوس ہوچکا ہو۔ یعنی وہ کتابوں کو بغیر کسی کی مدد کے پڑھ سکتا ہو۔ اس مرحلہ میں قدیم ادب وزبان اس کے لئے مفید ہوگی۔

۴۔ موجودہ ترقی یافتہ زبانوں کے سیکھنے میں جہاں نئے طریقوں کا دخل ہے وہیں رکارڈ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے ذریعہ طالب علم زبان کے صحیح لہجے، صوتی زیر وبم سے واقف ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہندوستان کی یونیورسٹیاں جہاں عربی شعبے قائم ہیں ہر قسم کے مضامین کا خود عربی بولنے والوں سے رکارڈ کرالیں تو طالب علموں کو زبان سیکھنے اور اُس سے دلچسپی پیدا ہونے میں کافی مدد ملے گی۔

بہرصورت ان مسائل کو عملی جامہ پہنانے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن یونیورسٹیوں میں عربی کے اساتذہ کی مشترکہ کوشش سے تمام دشواریاں آسان ہوسکتی ہیں۔

مشاہیر کے اولین صحیفے: ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا محمد حسین آزاد کے لڑکپن کی لکھی ہوئی پہلی تصنیفات کا نادر مجموعہ رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز پہلی بار ان نوادر کو منظر عام پر لایا ہے۔ بابی مذہب (ذاکر صاحب) رسالہ نکاح (آزاد صاحب) اعلان الحق (ابوالکلام صاحب) سرنامیں یونانی (مودودی صاحب) برہان سائز کے ۱۰۸ صفحات، خوبصورت جیکٹ، قیمت بیس روپے ـــ برہان کے خریداروں کے لئے تین ماہ تک پچاس فیصد رعایت۔

پتہ: مینیجر برہان اردو بازار، جامع مسجد، دہلی - ۶